OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

اُردو نعتیہ قصیدہ: موضوعاتِ تشبیب اور ان کے تخلیقی محرکات

(Urdu *Na'tiya Qaṣīda*: Themes of *Tashbīb* and their Creative Stimulations)

Navid Ahmad

Doctoral Candidate Urdu, AIOU, Islamabad/Assistant Professor of Urdu, Govt. Faridia Graduate College Pakpattan

Dr. Rukhsana Bibi

Post-Doctoral Researcher, University of Oxford, UK/ Assistant Professor of Urdu, GC Women University, Faisalabad

Dr. Shehzad Ahmad

Assistant Professor, Tariq Bin Ziyad College, Karachi

Abstract

Qaṣīda is a significant genre of poetry. It was mainly devoted to eulogizing kings, heroes, nobles, Prophets, sages and saints. Urdu *Na'tiya Qaṣīda*, a subgenre of Urdu *Qaṣīda,* praises Prophet Muhammad (ﷺ). It has a variety of themes. *Tashbīb* is a part of *Na'tiya Qaṣīda.* It consists of complex stanzas that serve a preceding event or introduce what follows. Urdu poets have fully demonstrated their artistic and poetic skills in *Na'tiya Qaṣīda*. This paper studies the themes of Urdu *Na'tiya Qaṣīda* and its creative stimulations. It explores that different themes are there in *Tashbīb* of *Na'tiya Qaṣīda.* There are *Tashbībs* with spring, wisdom, advice, morals, adoration, pride, civilization, philosophy, grievances of the time etc. The theme of spring landscaping has been written by different poets in different styles, which is adorned with high imagination,

CC BY

exaggeration, forcefulness and majestic rhetoric. Adoring *Tashbīb* aims at getting the attention of the readers. The themes of pride and grievances of the time actually show the poet's sense of inferiority. *Munīr Shikohabādī* and *Moḥsin Kākorvī* expanded the canvas of *Na'tiya Qaṣīda* by adopting the themes related to politics and local Indian civilization. *Azīz Lucknowī, Nazm Tabātabā'ī, 'Alī Ḥāmid Sandelvī, Farīd Mānak Pūrī* and *Iqbāl Sohail* wrote philosophical thoughts on the creation of the universe and on life and death. *Khālid Ahmed* has introduced the features of modern *Qaṣīda* by adopting simplicity in various *Bahāriya Tashbībs*, but there is still ample scope for new experiments in this genre of Urdu Poetry.

Key Words: *Urdu Na't, Na'tiya Qaṣīda*, themes, stimulations

تمہید

قصیدہ وہ صنف سخن ہے، جو ایک شاعر کو درجۂ استناد عطا کرتی ہے۔ شاعری کی تکمیل خاص قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف ہے، جس شاعر نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا۔[1] جہاں تک قصیدے کے مزاج، اُس کے اجزائے ترکیبی اور ہیت کا تعلق ہے, تو اس اعتبار سے قصیدہ وہ مسلسل نظم ہے، جس کا پہلا شعر ہم قافیہ ہوتا ہے، اور یہ ایک ہی بحر اور وزن میں لکھی جاتی ہے۔ اہلِ ایران نے قافیے کے بعد ردیف کا رواج ڈالا۔[2] قصیدے میں اہل عجم نے شکوہ لفظی، زورِ بیان اور بلند تخیل کو مخصوص کیا، جس کی وجہ سے قصیدے کی طرف عالی دماغ ہی مائل ہوئے۔ جہاں تک قصیدے کی فنی اقسام اور بنت کا تعلق ہے، تو اس کی دو اقسام ہیں: 1۔ تمہیدیہ 2۔ خطابیہ۔ خطابیہ قصیدہ صرف مدح پر مبنی ہوتا ہے، جب کہ تمہیدیہ ایک ہی بحر اور ے قافیے کے تحت چار اجزا یا اراکین میں لکھا جاتا ہے۔ تمہیدیہ قصیدے کی توضیح میں ڈاکٹر ام ہانی اشرف لکھتی ہیں:

> تمہیدیہ قصائد کو ہی بیانیہ، تشبیبیہ اور غزلیہ بھی کہتے ہیں، اسی طرح اس کے تعمیری ڈھانچے میں چار ارکان شامل ہیں: 1۔ تشبیب 2۔ گریز۔ 3۔ مدح یا مذمت 4۔ دُعا۔[3]

مذکورہ چاروں اراکین کا باہم مربوط ہونا ضروری ہے۔ قصیدے کا پہلا رُکن تشبیب ہے۔ تشبیب کا لفظ شباب سے نکلا ہے۔ نام کے لحاظ سے یہ عشقیہ مضامین کے لیے مختص ہے، مگر اب یہ پابندی رائج نہیں۔ تشبیب کو نسیب بھی کہا جاتا ہے۔ اہل عرب مدحیہ

---

[1] مولوی نجم الغنی رام پوری، بحر الفصاحت، مرتبہ۔ سید قدرت نقوی (لاہور: مجلس ترقی ادب، 2011ء)، 1: 172۔

[2] ڈاکٹر خواجہ اکرام، اُردو کی شعری اصناف (دہلی: الائیڈ ٹریڈرس، س ن)، 6۔

[3] ڈاکٹر ام ہانی اشرف، اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1999)، 15۔

قصائد میں پہلے عشقیہ اشعار لکھا کرتے تھے، لیکن عرب کے بعد ایران اور ایران کے بعد ہندوستان میں فارسی و اُردو کے لیے یہ نوعیت مضمون مخصوص نہیں رہی، بلکہ ہر تمہید کو جس میں خواہ حسن و عشق کا مذکور ہو یا بہار و خواب کا تذکرہ ہو، سب کو تشبیب ہی کہنے لگے۔[4]

موضوعات تشبیب کے سلسلے میں ایک شاعر کو انتخاب کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ شاعر اپنے تخیل کو وسعت دے سکے اور اپنے شعبۂ دسترس کو کام میں لا کر قصیدے میں دلچسپی کا عنصر پیدا کر سکے۔ تشبیب میں شعرا کے پاس منظر نگاری اور محاکات نگاری کا وسیع کینوس موجود ہوتا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی قادرالکلامی اور فکری اپج کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ عرب و عجم کے شعرا نے موضوعات تشبیب کے حوالے سے اپنے اپنے تہذیبی ماحول سے اثرات قبول کیے ہیں۔ عربی شعرا نے ریگ زاروں، نخلستانوں، جنگجوؤں اور قافلوں کی آمد و برخاست کے مناظر کا نقشہ کھینچا، تو اہل فارس نے ایرانی موسموں، گل و بلبل اور اپنے ماحول کی تصویر کشی کی۔[5] اُردو قصائد کی تشبیب میں بھی موضوعات کی رنگا رنگی موجود ہے۔

ایک تخلیق کار اپنی سماجی زندگی کے خارجی عوامل سے کٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ کتنا ہی جانب دار رہنے کی کوشش کیوں نہ کرے اُس کے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں قبولیت یا رد کا ایک احساس بیٹھ جاتا ہے، جس کا اظہار کسی نہ کسی موقع پر ضرور کرتا ہے۔ تخلیق کار کی زندگی کے خارجی واقعات کے علاوہ اس کی شخصیت اور تخلیقی ذہن کی تشکیل کرنے والے عوامل کے تعین سے زندگی کے اہم سماجی و نفسی وقوعات اور حوادث کا سراغ لگا کر ہی ادبی تخلیقات کا جائزہ بہتر انداز میں لیا جا سکتا ہے۔[6]

کوئی تخلیق کار جب کسی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کچھ مقاصد ہوتے ہیں جنھیں تخلیقی محرکات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ محرکات نہ ہوں تو تخلیق کا وجود اپنی معنویت کھو بیٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق ایک مقصد کے تحت ہے اور اس کے پس پردہ ایک حکمت موجود ہے۔ یہ کائنات، یہ نظام شمسی اور یہ آسمان بے مقصد پیدا نہیں کئے گئے۔ ستاروں کی گردش دن رات کو وجود عطا کرتی ہے۔ سورج کی روشنی ہماری غذائی ضروریات پوری کرتی ہے۔ انسان کی پیدائش کا بھی ایک مقصد ہے، اور وہ یہ کہ اللہ کی بندگی کرے اور حدود اللہ کو قائم کرے۔ اسی طرح انسان کی تخلیقات بھی ایک خاص مقصد کی تکمیل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ انسان نے جب سوئی بھی بنائی تو اس کے پیش نظر پیوند کاری کا تصور موجود تھا۔ یہی صورت حال ادبی تخلیقات کی ہے۔ ایک شاعر یا ادیب اپنی تخلیق کے ذریعے کبھی اپنے احساسات لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے، کبھی اپنی صلاحیتیں منوانے کا خیال اس کے ذہن میں ہوتا ہے اور کبھی وہ اصلاح کے نقطۂ نظر سے معاشرتی ناہمواریوں کو تنقید کا نشانہ بنانے کے لیے اپنا قلم اٹھاتا ہے۔

قصیدے کی صنف بحیثیتِ مجموعی شعرا کے لیے سرکار دربار سے مادی منفعت کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ نعتیہ قصیدے کے اپنے تخلیقی محرکات ہیں۔ یہ اپنے اندر عقیدت کے جذبات، سیرت طیبہ کی عظمت اور جمالِ نبی ﷺ کی نظر نواز رعنائیوں کے

---

[4] مولوی جلال الدین احمد، تاریخ قصائد اُردو (الہ آباد: مطبع انوار احمدی، س ن)، 10۔

[5] ڈاکٹر سعادت سعید، "اردو قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ" (مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، پنجاب یونی ورسٹی، 2007)، 44۔

[6] ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی دبستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1996ء)، 160۔

تخلیقی محرکات سے مملو نظر آتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ نعتیہ قصیدے کے تشبیب میں موضوعات کا جو ایک وسیع منظر نامہ موجود ہے، اس کے پسِ پردہ کون سے عوامل کار فرما ہیں؟ یہ مضمون نعتیہ قصیدے کے انھی موضوعات تشبیب اور ان کے محرکات و عوامل کو دریافت کرنے کی کوشش ہے۔

آمد بہار کا موضوع

اُردو کے نعتیہ قصائد کی تشبیب میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا موضوع، بہاریہ منظر نگاری پر مبنی ہے۔ یہ موضوع نعت سے مناسبت بھی بہت رکھتا ہے۔ نعت مدحِ رسول کریم ﷺ ہے کہ جن کی آمد خزاں رسیدہ سماج کے لیے بہار ثابت ہوئی۔ معاشرتی برائیوں کے خار تلف کیے گئے؛ ایثار و وفا کے گلاب اگائے گئے؛ امن اور خوش حالی کی خوش بُو چار دانگ عالم میں پھیل گئی؛ باطل کا دور ختم ہوا اور اس کی جگہ سچائی کی تازگی نے لے لی؛ رواداری، اخوت اور عالمی بھائی چارے کی نشو و نما ہوئی اور احترام آدمیت کے پژمردہ شجر پر نئی کونپلیں پھوٹیں؛ فخر و غرور اور طبقاتی بڑائی کے حنظل متاصل ہوئے اور انصاف اور مساوات کی خوش نما بیل منڈھے چڑھنے لگی۔ الغرض جس موسم اپنے انجام کو پہنچا اور بادِ صبا و شمیم نے فکر انسان کو پاکیزگی عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا نے اپنے نعتیہ قصائد کا آغاز موسم بہار کی معجز نوائیوں سے کیا ہے۔ چوں کہ بہار کا منظر ہر دور اور ہر دیار کے نعتیہ قصیدے کے لیے مرغوب رہا ہے، اس لیے اس کو سدا بہار موضوع قرار دیا جا سکتا ہے۔ دکنی دور میں علی عادل شاہ ثانی جو شاہی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے بہاریہ تشبیب میں جشن نوروز کی بہار کا ذکر کیا ہے۔ سورج دولھا بنا ہے اور اس نے زری کا لباس زیب تن کیا ہے۔ ستارے باراتی ہیں، اُس نے ثریا کا سہرا باندھا ہے۔ مشتری نے مشاطگی کرتے ہوئے ہلدی کا لیپ لگایا ہے؛ ابر نے درختوں کو مشروب پلایا ہے؛ گل چنبیلی اور نرگس کھلے ہوئے ہیں؛ خوش الحان پرندے گنگنا رہے ہیں اور مور ناچتے پھرتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

ہوا پروا منجے کا کر ستاریاں کا تگٹ تسپر — مشاطا مشتری ہو کر ہلد سورج لگایا ہے
پنکھی خوش مغز ہو سیارے اپس میں اپ لگے گانے — میوراں ناچتے ٹھارے بدل بر دنگ بجایا ہے
گلابی پھول پر دعویٰ لگیا کرنے سمن سیں تی — کہیا مالی نکر دعویٰ بڑا وو ناؤں پایا ہے
وہ بولیا باغ مالی سوں بڑا ہے ناؤں سو کس کا — کہیا وہ اسم احمد کا جنے دیں اپ نپایا ہے[7]

یہ ایک عمدہ بہاریہ تشبیب ہے جسے شاعر نے اپنے تخیل کے رنگوں سے دل آویزی بخشی ہے۔ اگرچہ تشبیب ہذا میں قدیم اُردو لہجہ غالب ہے، لیکن منظر نگاری میں شاہی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بہاریہ منظر کشی میں مومنؔ نے بھی کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مومنؔ نے اکتالیس شعروں کی ایک بھرپور بہاریہ تشبیب کہی ہے جس میں انھوں نے نسیم گلشن کے معجز نوا اثرات، چمن کی صفائی اور ہوائے چمن کی مشاطگی کو مرصع انداز میں بیان کیا ہے۔ مبالغہ، نازک خیالی، بلند تخیل اور ندرت فکر اور زور بیان کی حامل یہ تشبیب طب اور نجوم کی اصطلاحات سے بھی مزین ہے۔ طبی اصطلاحات میں کابوس، صالح الکیموس، ایلاؤس، شاموس، کیلوس، اصل السوس، مغز فلوس اور مبطوں کا شاندار استعمال دیکھنے میں آیا ہے۔ مثالیں دیکھیے:

زہے فریب صفا! خاک بیز ہے گلچیں — پڑے جو وسعت گلزار میں گلوں کے عکوس

7 علی عادل شاہ ثانی شاہی، کلیات شاہی، مرتبہ۔ سیّد مبارز الدین رفعت (علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو، 1962ء)، 103 تا 105۔

چمن کی خاک سے گلگونہ اب بناتے ہیں — شگفتہ تا دم رخصت بھی ہو عذارِ عروس
عجب نہیں کہ بسان مگس غسل اگلے — گر ان دنوں ہو کوئی مبتلائے ایلاؤس
قوائے نامیہ کو نا گوار ہے کتنا — کہ ہضم رابعہ محتاج ہو سوئے کیلوس[8]

یہ تشبیب مومن کی علمی وسعت، فنی پختگی اور قادرالکلامی کو اُجاگر کرتی نظر آتی ہے۔ قصیدے کا لفظی شکوہ جو اُس دور میں قصیدے کے فنی معیار اور کامیابی کی دلیل بن چکا تھا، اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ مومن کو طب اور علم نجوم میں دست گاہ حاصل تھی۔ کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان اصطلاحات کو کامیابی سے برتا ہی نہیں بلکہ ان سے شعریت کے حامل عمدہ اشعار تخلیق کیے ہیں۔ اسی قبیل کی ایک خوب صورت بہاریہ تشبیب مولانا قاسم نانوتوی (م1880ء) کے نعتیہ قصیدے کی زینت بنی ہے۔ بہار نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے نئے نظام کے خوش گوار اثرات کا استعارہ بھی ہے۔ سو آپ ﷺ کی آمد مسعود بہار سے کسی طرح کم نہیں، اور دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ بہار کا منظر انسانی قلب و ذہن کو تازگی عطا کرتا ہے۔ تازگی، فرحت، رنگ و نکہت، طمانیت اور فطرت کے خوب صورت مناظر کے بعد نعت جیسے پاکیزہ مضمون کا روح کو سرشار اور معطر بنانا عین فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہاریہ تشبیب موضوعِ نعت سے مطابقت میں دیگر سب موضوعات پر مقدم ہے۔ قاسم نانوتوی نے فطری مناظر کی تصویر کشی میں شعری جمالیات اور تخیل کی رنگ آمیزی کو ملحوظ رکھا ہے، جس سے قاری کی دل بستگی کا پورا سامان ہو گیا ہے۔ چند شعر دیکھیے:

خوشی سے مرغ چمن ناچ ناچ گاتے ہیں — کف ورق سے بجاتے ہیں تالیاں اشجار
سمجھ کے تخم بشر کیا عجب جو مُردوں کو — قوائے نامیہ دیں اب کی بار برگ و بار
شرار دانۂ بارود کو لگیں ہیں پھول — عموم فیض بہاری سے آگ ہے گلزار
کمر پہ بارِ گراں بوئے گل، تلے پھسلن — نہ لڑکھڑائے کہاں تک ہوا دم رفتار[9]

بہاریہ تشبیب لکھنے والے دیگر قصیدہ نگاروں میں امیر مینائی، محسن کاکوروی، نظم طباطبائی، عزیز لکھنوی اور محمد مصطفی جوہر کے نام نمایاں ہیں۔ بہاریہ منظر کشی میں نعت کے موضوع سے مناسبت کی صورت تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ شعرا کے لیے جولانیِ طبع کے بھی مواقع موجود ہیں۔ شعرا نے بہار کو اپنی فنی مہارت، زور بیان اور علمیت کے جادو جگانے کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ گویا یہ موضوع شعرا کی نفسیاتی طمانیت کا ذریعہ ٹھہرا ہے۔

پند و نصائح

اُردو نعتیہ قصائد میں حکمت واخلاق کی حامل تشابیب کی بھی کمی نہیں۔ یہ موضوع بھی نعت سے فکری مماثلت رکھتا ہے۔ فلسفۂ اخلاق کی تعلیم وترویج انبیاے کرام کے ترجیحی مقاصد میں سے ایک ہے۔ یہ موضوع فکری پاکیزگی کا حامل ہے اور تزکیۂ نفس کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا استعمال مہارت سے کیا جائے۔ نصیحت بذات خود ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ قصیدہ ایک مشکل صنف سخن ہے، اُس میں ایک خشک مضمون شامل کرنا مزید مشکل امر بن جاتا ہے، کیوں کہ راہِ راست

---

[8]مومن، کلیات مومن، مرتبہ۔ کلب علی خاں فائق (لاہور: مجلس ترقی ادب، 2008ء)، 296،295۔

[9]مولانا محمد قاسم نانوتوی، قصائد قاسمی (دہلی: مطبع مجتبائی، 1309ھ)، 2تا4۔

سے ہٹا ہوا ذہن کسی بھی صورت نصیحت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس امر کے لیے قرآن مجید نے حکمت و دانائی کی شرط عائد کی ہے۔ ناصح کو چاہیے کہ وہ حکمت سے، ہمدردی سے، عملی مثال سے اور غیر محسوس انداز میں اخلاق کی ترویج کو ممکن بنائے۔ جہاں تک فلسفۂ اخلاق کے موضوعات کا تعلق ہے، تو شعرا نے تشبیب میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی، عشق حقیقی کی آزمائش، خوشامد کی مذمت، ترک حرص و ہوس، یادِ الٰہی کی اہمیت، عالی ہمتی کے فوائد کے علاوہ ثابت قدمی، عاجزی، خاموشی اور صبر و استقامت جیسے صوفیانہ مضامین بیان کیے ہیں۔ چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

ولی دکنی:

عشق میں لازم ہے اوّل ذات کوں فانی کرے — جو فنا فی اللہ دائم یادِ یزدانی کرے[10]

سوداؔ:

ہنر پیدا کر اوّل ترک کیجو تب لباس اپنا — نہ ہو جوں تیغ بے جوہر و گر نہ ننگ عریانی
خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی — نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی[11]

مصحفی:

غافل تو جا کے گور غریباں کی سیر کر — ٹوٹی ہوئی پڑی ہیں جہاں سیکڑوں مزار
ہوتی بسر ہے سب کی بہ یک نیم پارہ ناں — حرص و ہوا کو چاہے تُو دے جتنا اختیار[12]

صابر دہلوی:

نہ قدرِ رتبۂ عالی ہو پست فطرت کو — کہ خاک کو نہیں ہوتا کبھی ہوا پہ قیام
دو چند مرتبہ چاہے تو اپنی جنس سے مل — کہ ہو ویں ایک سے دو حرف باعث ادغام
دنی سے فائدہ ہو سربلند سے تکلیف — ہو آسیا و فلک سے ہزار نسبت تام[13]

فکر و فلسفہ کا موضوع

نعتیہ قصائد میں فکر و فلسفہ کا موضوع بھی موجود ہے، خاص کر زندگی کے بارے میں قصیدہ گو شعرا کے ہاں فلسفیانہ نقطۂ نظر کی مختلف جہتیں موضوع بحث بنی ہیں۔ تصورِ خدا، تخلیق کائنات، جبر و قدر، فنا و بقا اور آفرینش، وہ بڑے موضوعات ہیں جن کے بارے میں فلسفیانہ اظہار کی صورتیں سامنے آئی ہیں۔ اُردو شاعروں میں صرف اقبال ایک فلسفی شاعر ہیں، لیکن اُن کے ہاں نعتیہ قصیدہ مروجہ ہیئت میں دستیاب نہیں۔ شاطر مدارسی کے قصیدے "اعجاز عشق" میں فلسفے کا تاریخی ارتقا بیان ہوا ہے، اور اس میں نعت کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نظم طباطبائی، علی حامد سندیلوی، سرکشن پرشاد شاد، فرید مانک پوری، عزیز لکھنوی، اقبال سہیل اور جمیل مظہری کے ہاں تشبیب میں مختلف فلسفیانہ افکار کی جھلک ملتی ہے۔ فلسفہ عوام کا موضوع

---

[10] ولی دکنی، کلیاتِ ولی دکنی، مرتبہ۔ نورالحسن ہاشمی (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 1996ء)، 348۔

[11] محمد رفیع سودا، کلیاتِ سودا، مرتبہ۔ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی (لاہور: مجلس ترقی ادب، 2004ء)، 2: 3 تا 5 ۔

[12] غلام ہمدانی مصحفی، کلیاتِ مصحفی، مرتبہ۔ نورالحسن نقوی (لاہور: مجلس ترقی ادب، 1999ء)، 9:45۔

[13] صابر دہلوی، ریاضِ صابر (حیدرآباد دکن: مطبع اخبارِ آصفی، 1304ھ)، 276۔

نہیں خواص کا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ عوام سے متعلق ضرور ہے، کیوں کہ اس میں حیات و ممات کے مباحث آفاقی اور عوامی نوعیت کے ہیں اور یہی امر ایسی تشابیب کو دلچسپی کے قابل بناتا ہے۔ ایسے موضوعات کا قصیدے میں جگہ پانا ایک طرف قصیدے کے کینوس کی وسعت کو اُجاگر کرتا ہے، تو دوسری طرف شعرا سے عام فہم اسلوب کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ اس طرح کی فلسفیانہ تشبیب کا محرک شعرا کے علمی اظہار کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قصیدہ نہ کوئی درسی نظم ہے اور نہ ہی اس میں ایک فلسفے کی تمام جزئیات سموئی جا سکتی ہیں۔ اس سب کے باوجود اس طرح کے مضامین سے نعتیہ قصیدے کا دامن علم و جستجو سے ضرور مالا مال ہوا ہے۔ شعرا نے فلسفے کے حوالے سے کن موضوعات میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے، مختلف مثالوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

علی حامد سندیلوی نے ایک تشبیب میں شاعر اور ہاتف غیبی کے مابین مکالمے کا انداز اختیار کرتے ہوئے خالق کائنات، فلسفۂ تخلیق اور اس کے مراحل اور مقاصد پر خاطر خواہ بحث کی ہے۔ آغاز استفہامیہ انداز میں ہوا ہے، جس میں ہاتفِ وحدت نے شاعر سے اُس کی تخلیق اور خالق کے بارے میں سوالات کیے ہیں۔ خدا شناسی کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا یہ موضوع نہ صرف نعت سے مناسبت رکھتا ہے، بل کہ ہر ذی شعور کو دعوتِ فکر دیتا نظر آتا ہے۔ اس کے موضوعات آفاقیت کے حامل ہیں۔ انگریزی کے شاعر جان ملٹن نے اپنی نظم "پیراڈائز لوسٹ" میں جس طرح اپنے مذہبی خیالات پیش کیے، اسی طرح علی حامد سندیلوی نے اسلامی عقائد کو موضوع بنایا ہے۔ اُنھوں نے آفاقی نوعیت کے چند سوال قاری کے سامنے رکھے ہیں، جو نا صرف وجودِ باری تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں بل کہ انسانی فکر کو مہمیز لگانے میں بھی موثر ثابت ہوئے ہیں۔ اُن کے استفہامیہ لہجے سے اشعار کی تاثیر دو چند ہو گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نقطۂ پُرکار ہستی کون ہے، مصدر ہے کون؟ بعد واجب کون ہے ممکن وجودِ لاجواب
عالم ارواح کا قصہ ہے تجھ کو کچھ بھی یاد محو اس کو صفحۂ دل سے کیا یاں مثل خواب
چار عنصر جسم میں تیرے ہوئے کس طرح ایک شاہد وحدت ہوئے کیوں باد و آتش، خاک و آب[14]

اس کے علاوہ نور محمدی، الست کی رات، ازلی نبوت اور دیگر موضوعات بھی اس تشبیب کا حصہ ہیں۔ اسلامی تہذیب و عقائد فضا پر غالب ہیں، لیکن بنیادی خطاب انسان سے ہے۔ استفہامیہ انداز نے اسے دل چسپی عطا کی ہے، جس سے موضوع کی ثقالت قدرے کم ہو گئی ہے۔ فرید مانک پوری کے ہاں بھی کائنات کی تخلیق اور انساں کے اشرف المخلوقات ہونے کا مضمون ملتا ہے، لیکن انھوں نے اسے شعری تازگی نہیں بخشی اور سپاٹ انداز میں پیش کر دیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

ہوائے دست قدرت سے ہوئی ذرات کو حرکت طلسم عالم امکاں میں پیدا ہو گئے جوہر
شرف تھا ذرۂ ارضی کو کل ذراتِ عالم پر غبارِ ذرۂ خاکی ملائک کا ہوا افسر[15]

مہاراجہ سر کشن پرشاد شادؔ کے نعتیہ مجموعے "ہدیہ شاد: میں 70 شعروں کا ایک نعتیہ قصیدہ موجود ہے جس کی تشبیب میں تلاش وجود کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔ 37 شعروں کی تشبیب شاعر کے داخلی احوال کی داستان سناتی نظر آتی ہے، جس میں انھوں نے

[14] سید علی حامد سندیلوی، قصیدہ نعتیہ (ہر دوئی: مقبول المطابع پریس، 1921ء)، 8 تا 9۔
[15] عبد الشکور فرید مانک پوری، فضائل حیدری (لکھنو: انڈین پریس، س ن)، 24۔

حقیقت کی جستجو، جبر و قدر، مذہبی رواداری اور انسانی عظمت کے حوالے سے حقیقت پسندانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثالیں دیکھیے:

میں وہ شہباز باغ وحدت ہوں — کہ ہوں آزاد کچھ نہیں مجبور
ہوں امانت کا اپنی میں مزدور — کہیں خسرو ہوں اور کہیں ہوں وزیر
کہیں کاشی مقام ہے میرا — کہیں کعبہ ہوں، قبلہ جمہور[16]

شکایتِ زمانہ

شکایت زمانہ، نعتیہ قصائد میں ایک اور اہم موضوع کے طور پر نظر آتا ہے۔ جس عہد میں اہل کمال ناقدری کا شکار ہوں، اخلاقی قدریں رُو بہ زوال ہوں اور نااہل اقتدار و اختیار سے نوازے جائیں، تو حرف شکایت لب پر آنا فطری سی بات ہے۔ اسے بھی ایک سدا بہار موضوع قرار دیا جا سکتا ہے، کیوں کہ صوفیا کے نزدیک ہر آنے والا دور قحط الرجال کی طرف گامزن ہے۔ عالی ظرفوں اور اہلِ دل کے اُٹھ جانے سے خود غرض اور انسانیت ناآشناؤں کا معاشرے میں شور و شر کا ہنگامہ برپا کرتے پھرنا باعث تشویش ہے۔ اس تشویش کی بازگشت نعتیہ قصائد کی تشبیب میں اکثر سنائی دیتی ہے۔ اس رُجحان کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ غم ذات کے اظہار سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، گویا یہ بھی شاعر کے کتھارسس کی ایک صورت ہے، اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ استغاثہ کے ذریعے استمداد طلب کی جائے اور مداوے کی صورت نکالی جائے۔ مصحفی کے ایک قصیدے میں اپنی فنی عظمت کے عدم اعتراف پر شکایت کرتے ہوئے حاسدین کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

بعضوں کو گماں ہے یہ کہ ہم اہل زباں ہیں — دلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں
سیفی کے رسالے پہ بنا ان کی ہے ساری — سو اس کو بھی گھر بیٹھے وہ آپ ہی نگراں ہیں
اک ڈیڑھ ورق پڑھ کے وہ جامی کا رسالہ — کرتے ہیں گھمنڈ اتنا کہ ہم قافیہ داں ہیں[17]

مصحفی کی اس تشبیب کا محرک بلاشبہ اُن کی معاصرانہ چشمک کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ سودا کے شاگردوں اور انشا کے ساتھ اُن کے ادبی مناقشوں کو سامنے رکھیں تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مصحفی اپنے ہم عصروں سے نالاں رہے، جس کی ایک وجہ برتری کا زعم بھی ہے۔ مصحفی کے اعتراضات اور شکایت محض کھوکھلی جذباتیت کے سوا کچھ نہیں کیوں کہ سودا اور انشا دونوں فنی و فکری لحاظ سے نابغۂ روزگار شخصیات ہیں اور مصحفی سے کسی طرح کم نہیں۔ بہر حال اُنھوں نے اپنا مافی الضمیر بیان کر کے اپنے کتھارسس کی صورت پیدا کر لی۔ سوال یہ ہے کہ نعت جیسے بابرکت موضوع کے ساتھ شکوہ شکایت اور طعن و تشنیع کا رُجحان کس حد تک روا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شکایت اگر ظلم کے خلاف ہو اور اُس میں اجتماعی اظہار کی صورت موجود ہو، جیسے کہ واقعۂ کربلا سے متعلق نظموں میں ہوا ہے، کہ جن میں ابن زیاد، یزید اور ظالم کے آلۂ کاروں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، تو اس رویے کا جواز بنتا ہے۔ مصحفی کا معاملہ الگ ہے۔ اُن کے ہاں خود پسندی، احساس برتری اور ہٹ دھرمی کا رویہ موجود ہے۔ انھوں نے انشا کی صلح کی پیش کش ٹھکرا دی اور فتنہ و فساد کو ناحق طول دیا۔ اس طرح کی بے جا شکایت قابل تحسین نہیں۔ یہاں ہم اسیر

[16] مہاراجہ کشن پرشاد شاد، ہدیہ شاد (حیدرآباد، محبوب پریس، 1317ھ)، 168 تا 170۔
[17] مصحفی، کلیات مصحفی، 36:9۔

لکھنوی کی تشبیب کا ذکر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بھی شکایت زمانہ کا مضمون باندھا ہے، لیکن اُس میں حقیقت نگاری کا عنصر موجود ہے۔ وہ روزگار کے سلسلے میں پریشان حالی کا شکار ہوئے اور ضعف وناتوانی نے جب زندگی کی ہمہ ہمی چھین لی تو وہ شکوہ کناں ہوئے، جسے ایک فطری امر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ درویش طبع انسان تھے، دوسرا اُن کے ہاں زمانے کے احوال اگر آئے ہیں تو حقیقت نگاری کے طور پر آئے ہیں اور انھوں نے ذاتی تعصب سے بالاتر ہو کر سماجی، انسانی رویوں کی ترجمانی کی ہے۔ اُنھوں نے انسانی نفسیات کے جو مشاہدے پیش کیے ہیں وہ ایک دم درست اور ناقابل تردید ہیں۔ انھوں نے معاشرے میں بڑھتی ہوئی نفرت، بے حسی اور بدگمانی کو نہایت مؤثر تمثیلوں سے اُجاگر کیا ہے۔ گویا ان کا کردار ایک اصلاح کار کا سا ہے۔ مثالیں دیکھیے:

شریک حال کب آفت زدوں کا کوئی ہوتا ہے　　بجائیں ناخدا بغلیں اگر کشتی ہو طوفانی
یہ رسم ترک الفت ہے کہے سو شعر اگر شاعر　　ملے مصراعِ اوّل سے نہ کوئی مصرع ثانی
تماشائی ہیں گلزار جہاں کے بدگماں ایسے　　کریں شبنم سے گل پر تہمتِ آلودہ دامانی[18]

فخر و تعلّی کا موضوع

فخریہ تشبیب اسی سے ملتا جلتا موضوع ہے، کیوں کہ دونوں کے شاخسانے انسان کی ناآسودہ خواہشات سے ملتے ہیں۔ فرائڈ کے نزدیک احساس برتری بھی احساس کم تری کی ایک شکل ہے۔ اس لحاظ سے یہ موضوع نعت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں فخر و تعلّی ایک منفی رُجحان ہے جس کی نعت میں گنجایش نہیں۔ قصیدہ گو شعرا نے تعلّی کے اشعار کے بعد گریز میں اس منفی سوچ کی مذمت کرنے کے بعد نعت کا جواز نکالا ہے۔ ہاں اگر تعلّی کو داخلی جذبات کی ترجمانی سے ہٹ کر محض فنی اظہار کے طور پر لیا جائے تو دوسری بات ہے، جیسا کہ صابر دہلوی کی فخریہ تشبیب ہے۔ اسی طرح حالی کے ایک نعتیہ قصیدے میں بھرپور تعلّی کے اشعار ملتے ہیں، جو صرف مخالفیں پر اپنی برتری ثابت کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں:

ہوں تماشائے شہر نابینا　　ہے برابر مرا خفا و ظہور
کون دیکھے مرے چمن کی بہار　　مر گیا عندلیب نیشاپور
شرح نقطہ کی گر کروں تحریر　　تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور[19]

حالیؔ کا یہ قصیدہ منفی رُجحان کا عکاس ہے۔ وہ اس قصیدے کے حاشیے میں خود لکھتے ہیں کہ یہ اشعار انھوں نے ہم عصر حاسدین کو سنانے کے لیے کہے تھے، مگر غلطی کا احساس ہوا تو نعت کہہ کر خاتمہ کیا۔[20] گویا حالیؔ جیسا درویش منش بھی نرگسیت کا شکار ہے، حالاں کہ فخر و غرور اور لاف زنی کا رویہ زندگی کے کسی مرحلے میں قابل داد نہیں، کجا اسے نعت میں بیان کیا جائے۔

نواب صفدر علی خاں، جن کا تعلق ریاست رام پور کے نواب گھرانے سے تھا، انھوں نے بھی فخریہ تشبیب کہی ہے، جو کمال مبالغہ کی حامل ہے۔ اسے اگر فن برائے فن کی کسوٹی پر رکھا جائے تو حالیؔ سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ یہ تعلّی سخن گسترانہ ہے۔ یہ بات اس لیے درست ہے کہ نواب صفدر کی کسی سے معاصرانہ چشمک نہیں تھی۔ اُنھوں نے اس لاف گزاف کو اہل سخن کی رسم کے

---

[18] سید مظفر علی اسیر لکھنوی، مجمع البحرین (لکھنو: نول کشور، س ن)، 2: 3، 2۔

[19] مولانا الطاف حسین حالی، دیوانِ حالی (لاہور: نذیر سنز پبلشرز، 1992ء)، 159 تا 161۔

[20] حالی، دیوانِ حالی، 159۔

طور پر لیا ہے۔ اُن کے ہاں تعلّی برائے فن کارویہ گراں نہیں گزرتا۔ صفدر نے منطق، معنی، کشف، فلسفہ اور علم لغت و حدیث میں یکتائی کا دعویٰ کیا ہے۔ اُن کے کلام سے چند اشعار دیکھیے، جن میں تقابل و موازنہ کا رنگ نمایاں ہے:

میرے محیط فکر میں رود کی ایک موج ہے　　میرے بیاض شعر کا جزو ہے ایک عنصری
جامی و املی و کمال، قاسم و فطرت و ظہیر　　شرم سے سب ہیں سرنگوں خاک کریں گے ہم سری
حق کے تلامذہ جو ہیں اُن میں وحید عصر ہوں　　ملتی مجھے نبی کے بعد ہوتی اگر پیمبری
ایسے سخن اگر کہے میں نے تو کیا مضائقہ　　اہل سخن کی رسم ہے لاف و گزاف شاعری[21]

فخریہ تشبیب لکھنے والوں میں ہوش بریلوی، سرو سہارن پوری، حالی، عبد الہادی وفا، صفدر رام پوری اور ولی الرحمن کے نام نمایاں ہیں۔

داخلی احوال کا بیان

بعض شعرا کے ہاں داخلی احوال کا بیان تشبیب میں بطور موضوع استعمال ہوا ہے۔ ہر شاعر کا داخلی تجربہ الگ الگ ہوتا ہے، بھلے اُس کا خارجی محرک ایک ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کے غم کو ہر شاعر نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ میرؔ و غالبؔ کے ہاں نظریۂ غم کا اختلاف اس کی عمدہ مثال ہے، لیکن یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ تجربے کی سان پر ہی سوز و گداز کی دھار تیزی پکڑتی ہے، یعنی داخلی جذبہ تاثر کی شدت سے مملو ہوتا ہے۔ شفیق جونپوری (م 1963) نے نعتیہ قصیدے کی تشبیب میں اپنے 18 سالہ بیٹے کی وفات اور اس دنیا سے رخصتی کا الم ناک منظر بیان کیا ہے۔ چوں کہ اُن کا غم داخلی تجربے کا حامل ہے، اس لیے اس کی تاثیر اور شدت دوچند ہے۔ انھوں نے "شام" اور "تنہائی" کے استعاروں میں ایک باپ کے دُکھ کو بخوبی عیاں کیا ہے:

خدا حافظ نہ رہبر ہے نہ کوئی ہم سفر تیرا　　وہ تاریکی کہ گم ہو جائے خود آنکھوں کی بینائی
تجھے تو نیند بھی مشکل سے تنہائی میں آتی تھی　　یہ نامانوس، یہ انجان بستی کیوں پسند آئی
نگہ باں چپ، گلی سنسان، چلمن سر پٹکتی ہے　　چلا ہے لے کے سارے گھر کی رونق کوئی سودائی[22]

عالم گیر خان کیف (م 1940ء) کی داخلی کیفیت جدا ہے۔ اُنھوں نے نعتیہ قصیدہ لکھتے ہوئے عجز و انکسار کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ انھیں میدانِ نعت میں اپنی کم مائیگی اور زبان و بیان کی تنگ دامنی کا بخوبی احساس ہے، جس کا اظہار انھوں نے یوں کیا ہے:

زباں ناچیز، میں انسان، منھ ناچیز مجھ بد کا　　بھلا پھر مجھ سے وصفِ پاک ہو کیوں کر محمد کا
صفت خورشید عالم تاب کی ذرّہ سے کیا ہو گی　　غبار اُٹھ کر نشاں کیا پائے گا چرخ زبر جد کا
یہ وہ میداں ہے جس میں عالم وسعت بھی تنگی ہے　　یہ وہ حد ہے کہ جس کو بے حدی سے ربط ہے حد کا[23]

عصری حسیت

---

[21] نواب صفدر علی خاں، کلیاتِ صفدر (لکھنو: مطبع نول کشور، س ن)، 507۔

[22] شفیق جون پوری، خرمن (لکھنو: نسیم بک ڈپو، 1964ء)، 133، 132۔

[23] عالم گیر خاں کیف، وسیلہ شفاعت (آگرہ: مطبع انوار محمدی، 1328ھ)، 2۔

اکثر شعرا نے اپنی شاعری میں سیاسی و سماجی واقعات کی تفصیل بیان کر کے اس میں روح عصر کو سمویا ہے۔ منیر شکوہ آبادی (م1880ء) کا نام اس حوالے سے سر فہرست ہے۔ انھوں نے اپنے نعتیہ قصیدے "فریاد زندانی" میں داخلی و خارجی احوال کو موضوع بناتے ہوئے بھرپور عصری شعور کا ثبوت دیا ہے۔ تشبیب کے ایک سو تیرہ اشعار مغلیہ سلطنت کے زوال اور شاعر کے کالے پانیوں میں ایام اسیری کے الم انگیز تجربے کی خونچکاں داستان سے عبارت ہیں۔ تشبیب ہذا نعتیہ قصیدے کی روایت میں موضوع کی اہمیت کے حوالے سے انفرادیت کی حامل قرار دی جاسکتی ہے، جسے منیرؔ کی سخن دانی اور قادرالکلامی نے خاصے کی چیز بنادیا ہے۔ قصیدے کی فنی صفات کے حوالے سے یہ تشبیب موزوں تشبیہات، نادر استعارات، نازک خیالی، حسن تعلیل، مبالغہ آرائی اور زورِ بیان سے آراستہ ہے۔ فکری سطح پر منیرؔ نے امرا کی سہل پسندی، ذاتی مفادات اور عیش کوشی کی روش کو مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب میں شمار کیا ہے۔ باہمی خلفشار، فرقہ واریت اور اجتماعی سوچ کے فقدان نے ہندوستان کی سیاسی بساط اُلٹ دی اور نوکر مالک بن گئے۔ حکمران اور امرا پابند سلاسل کر دیے گئے۔ انگریزی عمل داری کے دور میں بادشاہ خود وظیفہ خوار تھا جو ملازمین کو تنخواہیں تک نہیں دے پاتا تھا۔ بعض اوقات تو اہل سخن کی دادرسی کے لیے بادشاہ کو خاندانی زیورات تحفے میں دینے پڑے۔ منیرؔ نے اہل کمال اور امرا کی کس مپرسی اور زوال کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اُس کی مثالیں دیکھیے:

چنے کھانے کو ترسیں صاحبانِ گوہر عالی　　صدف کو دے نوالہ موتیوں کا ابر نیسانی
بنائیں بیڑیاں تلواروں کو تڑوا کے گردوں نے　　کیا ارباب جوہر کو ہر اک حیلے سے زندانی
ہوئے فاقہ کشوں کے پیٹ نعمت خانۂ شاہی　　بنی ہے کیسۂ مفلس در دولت کی دربانی
پریشانی کے ٹھیکہ میں ہر اک دربار مجمع ہے　　اجارہ بستیوں کا لے کے خوش پھرتی ہے ویرانی[24]

اس تشبیب کا دوسرا حصہ جزیرہ انڈیمان کے احوال کے بارے میں ہے۔ انھوں نے وہاں کی برسات، بیماری، جغرافیائی حالات، ناقص غذا اور موسمی اثرات کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ قیدِ فرنگ کے مظالم اور قیدیوں کے ناگفتہ بہ حالات کی جزئیات موثر انداز میں بیان کی گئی ہیں:

کرو ارّہ کشی یا مٹی کھودو، چکیاں پیسو　　اگر ہو جاں بہ لب منھ میں نہ ٹپکائے کوئی پانی
لب شیریں کے بوسوں سے بھی بڑھ کر گڑ کی دقت ہے　　نہ پائیں صورت فرہاد اگر سر پھوڑیں زندانی
یہاں اربابِ لندن کی بھی رنگت تیرہ ہوتی ہے　　بنے مشکی اگر نقرہ دکھائے اپنی جولانی[25]

کلیم الدین احمد کے خیال میں اُردو قصیدے کی تشبیب میں بڑے موضوعات کی گنجایش تھی، لیکن اُردو قصیدہ نگاروں نے اس وسعت سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھایا۔[26] اگر وہ منیر اور نظم طباطبائی کی تشابیب پر نگاہ کر لیتے تو اُن کا نقطہ نظر مختلف ہوتا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ منیرؔ کے بعد اور کسی نے بھی عصری صورت حال کی حامل اس روایت کو نہیں اپنایا، البتہ محسن کاکوروی نے نعتیہ قصیدے میں ہندی عناصر سمونے کا تجربہ کیا ہے۔ محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدے "مدیح

[24] منیر شکوہ آبادی، کلیاتِ منیر (لکھنو: مطبع ثمر ہند، 1296ھ)، 8۔

[25] منیر، کلیات منیر، 11 تا 13۔

[26] کلیم الدین احمد، اُردو شاعری پر ایک نظر (پٹنہ: بک امپوریم سبزی باغ، 1985ء)، 1: 145۔

خیر المرسلین" کی تشبیب میں ہندومت کی صنم یات کا بھرپور ذکر ملتا ہے، جن میں گوکل، متھرا، کاشی، کرشنا، گنگا جل، گوپیوں، سری کرشن، کنہیا، جمنا، راجہ اندر اور امتل نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر ابو للیث صدیقی نے اسے ذوق اور سودا کی تشبیب سے زیادہ زوردار قرار دیا ہے۔[27] اگرچہ محسن سے پہلے سحر لکھنوی اپنے قصیدہ "در صفت بہار" میں ہندی صنم یات کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے لیکن نعتیہ قصیدے میں یہ پہلی کاوش تھی۔ اس کے بعد نظم طباطبائی نے بھی اسے برتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مختار الدین کے ہاں بھی قریب قریب یہی مضامین بیان ہوئے ہیں۔ جب محسن نے نعتیہ قصیدے میں ہندی تہذیب کا ذکر کیا تو ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور اسے کفریہ تشبیب قرار دے دیا گیا۔ اس پر محسن کو ہندی اصنام پر مسلم تہذیب کے غلبے کا جواز پیش کرنا پڑا۔ اپنے منفرد مضمون اور زور دار اسلوب کی بدولت یہ تشبیب نعتیہ قصیدہ نگاری میں اہم مقام رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلوط معاشرتی نظام میں باہمی اثرات کا اثر و نفوذ عام سی بات ہے۔ ہندو مسلم ثقافت میں لباس، کھانے، تہوار اور ادب میں تلمیحات تک مشترکہ ورثے کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ دکنی شعرا کی طرح محسن نے بھی مقامی اثرات قبول کیے، لیکن قابلِ ستایش بات یہ ہے کہ مقامی نظریات قبول نہیں کیے۔ چند اشعار دیکھیے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل — برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی — ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
دیکھیے ہو گا سری کشن کا کیوں کر درشن — سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل[28]

محسن کاکوروی پر ہندی تہذیب سے متاثر ہونے کا الزام لگا تو انھوں نے اپنی تشبیب کے تخلیقی محرک سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہندی تہذیب پر مسلم تہذیب کے غلبے کا مضمون باندھا ہے، جسے غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ امیر مینائی نے بھی محسن کے حق میں قصیدہ "بانت سعاد" کی تشبیب کے عشقیہ و فراقیہ مضامین کو بطور دلیل پیش کیا۔

عشقیہ و رندانہ مضامین

نعتیہ قصیدے کی روایت میں عشقیہ و رندانہ مضامین کی حامل تشابیب بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ مظہر علی ولاؔ، مصحفی، ممنون، امیر مینائی، محسن کاکوروی، سخن دہلوی، عزیز لکھنوی، جعفر قدسی جائسی، صادق حسین غبار، محشر لکھنوی اور ولی الرحمن کے ہاں عاشق کی مہجوری، محبوب کے سراپا، اس کے مظالم اور ساقی نامہ کے مضامین عمدگی سے ادا ہوئے ہیں۔ نعت سے قبل مذکورہ مضامین کا کوئی خاطر خواہ جواز نہیں بنتا، مگر اتنا کہ گریز میں شاعر اپنے خیالات کو فرسودہ اور باطل قرار دے دے اور اکثر شعرا نے ایسا کیا بھی ہے۔ شعرا کے ہاں اس طرح کی تشابیب کا بڑا جواز قصیدہ بانت سعاد ہے۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت کعب بن زہیر نے جو قصیدہ بانت سعاد پیش کیا، اُس کی تشبیب میں محبوب کے سراپا اور ہجر گزیدگی کے اشعار موجود تھے۔ فنی لحاظ سے بھی تشبیب کے موضوع کے انتخاب میں شاعر کو آزادی حاصل ہے۔ انھی مذکورہ عوامل کی بنا پر عشقیہ تشابیب سامنے آئی ہیں۔ نعت کے ساتھ عشقیہ مضامین رقم کرنے کا مقصد صرف اور صرف قاری کی توجہ حاصل کرنا ہے۔ ایک طویل قصیدے کو سننا سامعین کے لیے بھی ایک کڑا مرحلہ ہوتا ہے، جسے آسان اور دلکش بنانے کے لیے عشق و محبت کے مضامین کام

---

[27] ڈاکٹر ابو للیث صدیقی، لکھنو کا دبستانِ شاعری (علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی، 1944ء)، 323، 322۔

[28] محسن کاکوروی، کلیاتِ نعت محسن کاکوروی، مرتبہ۔ نورالحسن (لکھنو: اُتر پردیش اکادمی، 1982ء)، 95 تا 99۔

میں لائے جاتے ہیں۔ محبت کے جذبے میں ایک خلوص اور سچائی تو ہے، جس سے کسی صورت انکار ممکن نہیں، لیکن بے جا سراپا نگاری جس کا مقصد لذت کوشی کے سوا کچھ نہ ہو، قطعاً قابلِ تحسین نہیں۔ ممنون نے تو ایک قصیدے میں حد کر دی کہ اپنے محبوب کے سراپا میں سینہ، ساق، سرین، ناف اور انگیا تک کو موضوع بنایا ہے۔ مثال میں چند شعر دیکھیے کہ جن میں جذبوں کی اٹھان اور تخیل کی بلند پروازی تو ہے مگر مقصدیت کا فقدان ہے:

چین سے ایک جبش تک تھی عجب سیدھی راہ　　مانگ کا خط وہ جبیں سے جو گیا چوٹی تک
وہ صراحی گلو یا کہ بلوریں فانوس　　کہ نظر شعلۂ آواز کی آتی تھی بھڑک
اللہ اللہ نزاکت کہ کمر پر اُس کی　　کہیں ہل جاوے جو چوٹی وہیں آ جائے لچک[29]

اسی طرح عزیز لکھنوی کے قصیدے "مرات الصفا" میں شب ہجراں میں عاشق و محبوب کے احوال کی عمدہ منظر کشی موجود ہے۔ انھوں نے تقابلی انداز اختیار کرتے ہوئے محبوب اور محب کی داخلی واردات کو بڑے موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

وہاں پھولوں کو رنگ رُخ کسی کا کھینچ لایا ہے　　یہاں ہے خون دل سے بستر فرقت پہ گل کاری
یہاں ہے نالہ ہائے دل کو شوقِ آسماں گردی　　نزاکت کو ادھر آواز سے ہے میری بے زاری
وہاں وہ چھاؤں میں تاروں کی مست خواب آسائش　　یہاں نفرت کش ایذائے فرقت محو بیداری[30]

عاشق کی مہجوری کی منظر نگاری جعفر قدسی جائسی کو بھی بہت مرغوب ہے۔ انھوں نے اپنے قصائد کو جاذبیت عطا کرنے کے لیے یاس و حرماں کے مضامین خوبی سے نظم کیے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سر بالین عاشق کون ہے جُز بے کسی ہمدم　　مریض عشق کی ہوتی ہے کیا یوں ہی خبر داری
تغافل کی کوئی حد ہے اثر لیتے نہیں سُن کر　　وہ افسانہ کہ ہر فقرہ ہے جس ک نشتر کاری
نمک پاش جراحت ہائے دل شور محبت ہے　　مرے زخموں کو اب ہونے لگی مرہم سے بیزاری[31]

تخیلاتی منظر کشی

عشقیہ تشبیب کے علاوہ اردو نعتیہ قصائد میں تخیلاتی منظر نگاری بھی ملتی ہے۔ اس کے مختلف انداز ہیں۔ مثال کے طور پر غلام امام شہید کی بہاریہ تشبیب میں ایک خیالی محل کا ذکر ہے، جس کی آرائش کی ذمہ داری ایک خوب رُو نوجوان کے ذمے ہے، اور وہ حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ ولی الرحمن نے نیکی کی دلہن کا سراپا بیان کیا ہے جو آں حضرت ﷺ پر فریفتہ ہے، اور امتِ مسلمہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔ آرزو اکبر آبادی کے ہاں ستاروں کی منظر کشی ملتی ہے۔ یہی نہیں قصیدہ گو شعرا نے اپنے قصائد کو مرصع کرنے کے لیے مناظرے اور مکالمے کی تکنیک سے بھی استفادہ کیا ہے۔ منیر شکوہ آبادی نے حیات و مرگ، عزیز لکھنوی نے حسن و عشق اور محشر لکھنوی نے گل و بلبل کے مابین مباحثے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ مکالمے دعویٰ و دلیل کا دلچسپ انداز لیے

---

[29] میر نظام الدین ممنون، کلیات ممنون، مرتبہ۔ محمد اکبر الدین صدیقی (حیدر آباد دکن: نیشنل فاین پرنٹنگ پریس، 1972ء)، 1: 40 تا 42۔
[30] عزیز لکھنوی، صحیفہ ولا (الہ آباد: کتابستان، س ن)، 33۔
[31] سید محمد جعفر قدسی جائسی، قصائد قدسی (آگرہ: شمسی پریس، س ن)، 1۔

ہوئے ہیں۔ نعتیہ قصائد میں اظہار عجز کا مضمون اکثر مدح یا دعا میں برتا گیا ہے، البتہ صبا اکبر آبادی اور اعظم چشتی تشبیب میں ہی اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔

خلاصۂ بحث

اُردو نعتیہ قصیدے کی تشبیب متنوع موضوعات کی حامل ہے۔ شعرا نے اس میں اپنی علمی، فنی اور شاعرانہ مہارتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ بہار کی منظر نگاری کا مضمون مختلف شعرا نے مختلف انداز میں باندھا ہے، جو بلند تخیل، مبالغہ آرائی، زور بیان اور پُر شکوہ لفاظی سے آراستہ ہے۔ حکمت، نصیحت اور اخلاق کی حامل تشابیب کی بھی کمی نہیں۔ یہ دونوں مضامینِ تشبیب موضوعِ نعت سے بہت مناسبت رکھتے ہیں۔ عشقیہ تشابیب بھی کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ ان کا مقصد محض قاری کی توجہ حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ فخریہ اور شکایتِ زمانہ کے مضامین شعرا کی احساس کم تری کا پتہ دیتے ہیں۔ منیر شکوہ آبادی اور محسن کاکوروی نے سیاسی و مقامی ہندی تہذیب کے موضوع اپنا کر نعتیہ قصیدے کے کینوس کو وسعت دی۔ عزیز لکھنوی، نظم طباطبائی، علی حامد سندیلوی، فرید مانک پوری اور اقبال سہیل نے تخلیق کائنات اور حیات و مرگ کے بارے میں فلسفیانہ خیالات قلم بند کیے۔ خالد احمد نے مختلف تشبیب بہاریہ میں سادگی اور بے ساختگی کو اپنا کر جدید قصیدے کے خدوخال متعارف کروائے ہیں، لیکن ابھی بھی صنف قصیدہ میں نئے تجربات کی بے پناہ گنجایش موجود ہے۔